بے منزل راستہ

مختار لوبیس

ترجمہ : منصورہ احمد

بے منزل راستہ

مختار لوبس

ترجمہ: منصورہ احمد

مشعل
آر-بی 5 ' سیکنڈ فلور ' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک ' نیو گارڈن ٹاؤن ' لاہور 54600 ' پاکستان

MashalBooks.org

تعارف

مختار لوبس انڈونیشیا کے معروف ترین صحافیوں میں سے ہیں۔صحافت ہی کیا، کسی بھی لحاظ سے انہیں ایک ممتاز شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ۱۹۲۰ء میں وسطی سماٹرا کے علاقے فنان کباؤ میں پیدا ہوئے۔ان کے والدین کا تعلق سماٹرا کے باتک قبیلے سے تھا جو اپنی آزادی روح اور راست بازبیباکی کے لئے مشہور تھا۔

سات سے تیرہ برس کی عمر تک سکول کی تعلیم مکمل کی پھر انہوں نے تین برس تک ایک بزنس کالج میں پڑھا۔ اس کے بعد کی ساری حیرت انگیز تعلیم سراسر ذاتی ہے۔ ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ انہوں نے انڈونیشی صحافت میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان کی ساری جسمانی اور اخلاقی صلاحیتیں جمہوریت کے لئے وقف تھیں۔ایک روایت یہ ہے کہ اس سال ولندیزی فوجوں کے انڈونیشیا آنے کے بعد ان کے حامی سپاہی اس کے مضامین سے ناراض ہو کر اسے مارنے اس کے دفتر آ دھمکے تھے۔ وہاں جا کر انہیں پتہ چلا کہ چھ فٹ لمبا لوبس ان سے مقابلہ کرنے اور انہیں دروازے سے باہر پھینکنے کو بہت کافی تھا۔

لوبس نے بے شمار سفر کئے۔اپنی گرفتاری سے پہلے کے دس برس میں انہوں نے ملایا، برما، ہندوستان، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ، فلپائن، امریکہ، جاپان، کوریا اور آسٹریلیا کا دورہ کیا۔اس سفر نے انہیں ایک طرح بین الاقوامی شہری بنا دیا۔اس پر مستزاد ان کا بے شمار زبانوں کا علم ہے۔انہیں انگریزی، ولندیزی، فرانسیسی، ہسپانوی، جرمن اور جاپانی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔صحافی کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ان کی مدیرانہ ذمہ داریوں کے تنوع سے لگایا جا سکتا ہے۔ایک ہی وقت میں وہ ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر ایک ماہنامے کے مدیر، ایک ہفت روزے کے پبلشر اور ''سیاست'' نامی ایک ہفت

MashalBooks.org

روزے کے ثقافتی سپلیمنٹ کے معاون تھے۔ بہر حال ۱۹۵۶ء میں اپنے گھر میں اپنی پہلی نظر بندی تک ان کی شہرت جکارتہ کے روز نامہ ''انڈونیشیا رایا'' کے حوالے سے ہی تھی۔ یہ اخبار سماجی مسائل پر اپنی کڑی تنقید کے لئے مشہور تھا۔ اس زمانے میں ان کا سب سے اہم مضمون وہ تھا جس میں ۱۹۵۰ء میں ہارٹینی سے سوئیکارنو کی دوسری خفیہ شادی کا انکشاف تھا، ان کے مضمون کا نتیجہ سوئیکارنو کے خلاف احتجاجی جلوسوں کی صورت میں نکلا۔ جس میں خواتین کی تنظیمیں پیش پیش تھیں۔ اس وجہ سے لوبس سوئیکارنو کی لازوال نفرت کا سزاوار ٹھہرا۔

حالانکہ بیرون ملک ان کی زیادہ شہرت بطور صحافی کے ہے لیکن دراصل وہ صحافی سے آگے بھی بہت کچھ ہیں۔ ان کی دلچسپیاں لفظ کے محدود مفہوم میں صرف ''سیاسی'' نہیں ہیں ان کا اصل مسئلہ تو انسان کا بطور انسان کے وقار کا حصول ہے۔ یہی ان کی سب تحریروں، تخلیقی مصروفیات وتراجم اور ثقافتی سرگرمیوں کی روح ہے۔

ان کا بہترین میدان ''کہانی'' ہے جس میں انکا باریک مشاہدہ اور ہیئت کی چابکدستی بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی طنزیہ کاٹ انڈونیشی صورت حال کو اس طرح عالمگیر بنادیتی ہے کہ وہ دنیا بھر کے انسانوں کی حماقتوں اور کم ہمتی کی داستان لگنے لگتی ہے۔ وہ سوفٹ کی روایت کے نمائندہ ہیں، اسی کی طرح سخت چبھتا ہوا اور جنگ جویانہ اور ایمانداری کے ساتھ بددیانتی کے افشا میں بے رحم قلم ہے۔ ان کی ان صلاحیتوں کا بہترین استعمال ان کی انگریزی کتاب Twilight in Jakarta میں ہوا، جوانہوں نے جیل میں لکھی۔ جیل سے ہی یہ مسودے کی صورت میں انڈونیشیا کے باہر سمگل کر دی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں اسے ہوچنسن نے انگلستان میں شائع کیا اور اگلے برس وین گارڈ پبلشرز نے امریکہ سے چھاپا۔ فنی امنگ اور ولولے سے لکھی گئی اس کتاب میں آج بھی روز اول جیسی تاثیر موجود ہے یہ اپنے عصر کی مسحور کن عکاسی ہے، جو ہمیں انڈونیشی سیاست میں آزاد جمہوریت کے آخری برسوں میں مختلف مدارج پر بددیانتی اور مایوسی کی واضح تصویر دکھاتی ہے۔ ۱۹۵۴ء..................۱۹۵۵ء میں انہوں نے ''انڈونیشیا رایا'' کی ادارت کرتے ہوئے جو قلمی جہاد شروع کیا تھا، کتاب میں اس کو آگے بڑھایا ہے اور بدی کی ان طاقتوں کی نشاندہی کی ہے جو جراثیم کی طرح معاشرے کے جسم میں سرایت کر رہی تھیں۔ لوبس نے

MashalBooks.org

بتایا کہ کس طرح عقل وخرد کو ۱۹۵۲ء میں ہی ''بے منزل سفر'' لکھ کر لوبس نے ادب میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔

انڈونیشیا میں ادب کے فروغ کی داستان بھی ایک رزمیہ جیسی ہے۔ بھاشا انڈونیشیا، انڈونیشیا کی قومی زبان ہے اور مالے زبان کی جدید صورت، وہ ۱۹۲۸ء تک کوئی واضح شکل اختیار نہ کر سکی تھی، حالانکہ مالے زبان کی معلومہ تاریخ ہزار برس پرانی ہے۔ ۱۹۳۰ء سے یہ ایک ادبی اور تخلیقی زبان کے طور پر استعمال ہونا شروع ہوئی لیکن اس کا اصل فروغ ۱۹۴۲ء میں جاپانی قبضے سے ہوا جب انڈونیشی ادیب نے جدید انسان کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ کی۔ ایک ہی جھٹکے سے ولندیزی ایسٹ انڈین معاشرے کا ڈھانچہ زمین بوس ہو گیا۔ ولندیزی گھروں اور لائبریریوں کی لوٹ مار سے ایک اثر یہ پڑا کہ لائبریریوں میں بند علم و ادب اور خیالات کا خزینہ عام لوگوں تک بھی پہنچا۔ دوسری طرف انڈونیشی ادیبوں اور دانشوروں کے چھوٹے سے گروہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ان کے گرد و پیش میں صرف مایوسی رہ گئی اور انسانیت کی ایک لاوارث شکل۔ اس جھٹکے نے ادیبوں کی ایک نئی کھیپ تشکیل دی جن میں سے کچھ کو بعد میں ''۱۹۴۵ء کی نسل'' کا نام دیا گیا۔ ان کا سرخیل علامت نگار شاعر شارل انور تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ان سب نے اپنے منشور کا بہت موثر اعلان اس طرح کیا۔

''ہم ساری دنیا کے تمدن کے جائز وارث ہیں۔ ایک تمدن جسے ہم اپنے انداز سے فروغ دیں گے اور پھیلائیں گے۔ ہم عام انسانوں کے ہاں پیدا ہوئے اور ہمارے لئے یہی اصطلاح حوالہ ہو گی جس کی بنیاد پر ہم سوچ اور اظہار کی نئی صحت مند دنیائیں تشکیل دیں گے۔

ہماری خاکستری جلد، سیاہ بال اور نیچے کے رخ جھکی رخسار کی ہڈیاں ہمیں انڈونیشی نہیں بناتیں بلکہ ہماری سوچ اور کردار ہماری شخصیتوں کے بنیادی عناصر ہیں۔

ہم ایک نام دے کر اپنی انڈونیشی ثقافت کو محدود نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی قدامت کو فخر کا وسیلہ بنا کر مطمئن نہیں ہونا چاہتے بلکہ اسے ایک نئی اور توانا چیز کی حیثیت میں دیکھتے ہیں۔ اب انڈونیشی تمدن گلوب کے ہر کونے سے اثبات اور طاقت حاصل کرے گا ہم اپنی غلط قدروں کی اصطلاح کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کی سختی سے

MashalBooks.org

مخالفت کریں گے۔

ہمارے لئے انقلاب کا اصل مقصد پرانی اور دیمک خوردہ قدروں کو ختم کرنا اور ان کی جگہ نئی قدروں کو تشکیل دینا ہے۔ یہ مقصد پورا نہ ہونے تک ہمارا انقلاب ادھورا ہے۔ ہوسکتا ہے ہماری منزلیں ہمیشہ انوکھی نہ ہوں، لیکن ہماری بنیادی تلاش انسانیت کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اپنے مطالعے، تجربے اور خوابوں میں ہماری اپنی خوبیاں بھی شامل ہوں گی اور اپنے گردوپیش کے لوگوں کے حوالے سے ہم آرٹسٹ اور معاشرے کے باہمی ربط سے آگہی رکھنے والوں کی طرح زندہ رہیں گے۔''

اظہار کا یہ وقار اور انقلاب کے ابتدائی دنوں میں پیدا ہونے والے شونزم کی مخالفت بہت سے ان غیر ملکی دانشوروں کو اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ جنہوں نے دراصل ۱۹۴۵ء کے بعد انڈونیشیا کو دریافت کیا۔ مختار لوبس اظہار کی اس روایت سے منسلک تھے۔

بدقسمتی سے یہ ایک ایسی روایت ہے جو ۱۹۵۵ء تک اپنی توانائی ختم کر بیٹھی۔ ملک کی تیز رفتار اقتصادی پامالی، توقعات کی شکست اور مغربی نیوگنی کی ملکیت کے دعوے کے ساتھ منسلک مکمل طور پر تباہ کن جذبات زدگی نے، جس کی رفتار میں اضافہ ہورہا تھا، عالمگیر انسان دوستی کو غیر ضروری قرار دے دیا تھا اور قدیم روایات کے ملبے پر نئی دلچسپیوں کی تعمیر ہورہی تھی۔ سوشلسٹ حقیقت پسندی، فن برائے معاشرہ، ادب برائے عوام اور ''فن ایک کلہاڑے اور ایک ڈبری کس کی طرح کا ایک آلہ ہے'' کے سے مقولے مقبول ہو رہے تھے۔ یہ عشرہ گزر رہا تھا تو انتہا پسند قومیت پرستی اور کمیونسٹ پارٹی نے اس ادب کو جو سیاسی سے زیادہ انسان دوستی کا پرچار کرتا تھا، مدافعت پر مجبور کردیا۔ ۱۹۶۳ء میں شارل انورتک کی شاعری کی اس بنا پر مذمت کی جانے لگی کہ وہ وجودیت کی اخلاقیات کی علم بردار ہے اور اس میں غیر سیاسی وسیع المشربی کا زاویہ نظر موجود ہے۔ ان تمام سختیوں کی موجودگی میں بہت سے ادیبوں نے تخلیقی کام کو ناممکن قرار دے دیا اور دوسرے ادیب متنوع سچائیوں کی قدریں نمایاں کرنے لگے اور سیاسی مقاصد کے لئے لکھنے لگے۔

لوبس ان لوگوں میں سے تھے جن کا اعتماد پختہ ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ادب نویسی کو ترک کر دیا مگر وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ انڈونیشیا کی اقدار کے

معیاروں میں سرایت ہونے والے زہر سے نبرد آزمار ہے۔ ۵٦......۱۹۵۷ء میں انہیں ایک ماہ کے لئے قید کر دیا گیا۔ پھر اپریل ۱۹۵۱ء تک انہیں اپنے گھر میں مقید رکھا گیا۔ بعد میں وہ رہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تل ابیب میں انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کی دسویں جنرل اسمبلی میں شامل ہوئے۔ اگر چہ انہیں وہاں خبر دار کر دیا گیا تھا کہ انڈونیشیا میں واپسی پر انہیں پھر گرفتار کر لیا جائے گا، اس لئے کہ انہوں نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اپنے وطن میں پریس کی پابندیوں پر شدید تنقید کی تھی، مگر انہوں نے واپس آنا اپنا فرض سمجھا۔ واپسی پر انہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹٦٦ء میں سوایکارنو کے زوال تک انہیں نظر بند رکھا گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے، قید کی مدت کیسے برداشت کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کے پاس ایک خفیہ ہتھیار تھا یعنی ان کی بیوی حالی۔ اس نے ثابت قدمی سے اخلاقی امداد مہیا کی تھی اور لایون میں جہاں انہیں محبوس رکھا گیا تھا، وہاں وہ طویل سفر طے کر کے ان کے پاس آتی رہی ان کی خوراک کا بندوبست کرتی رہی، ان کے دو بچوں کے بارے میں بتاتی رہی اور باہر کی دنیا کی بابت مطلع کرتی رہی۔ انہوں نے انقلاب کے ان ابتدائی ایام میں ایک خواب دیکھا تھا ایک نظریہ اختیار کیا تھا اور یہ وہی خواب، وہی نظریہ تھا جو انہیں قوت بخشتا رہا اور یہ سب کچھ ''بے منزل سفر'' میں محفوظ کر دیا گیا۔

ناول کی کہانی کا زمانہ وہ ہے جب ۱۹۴٦ء میں ولندیزیوں نے برطانوی نگرانی اور لنگار جاتی معاہدے (انڈونیشیا کی ریاست ہائے متحدہ اور نیدر لینڈ............انڈونیشیا یونین کی تخلیق) کی خلاف ورزی کی جو پہلا پولیس اقدام کہلاتی ہے۔ مرکزی کردار عیسیٰ کا ہے جو ایک سکول ٹیچر ہے وہ ایک نرم خو، سیدھا سادا انسان ہے جو جاپانی قبضے کے مصائب سے گزرا ہے اور اب ولندیزیوں کی طرف سے برطانوی وقفہ حکمرانی کی وجہ سے چکرا گیا ہے۔ عیسیٰ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ذمہ داری کیا ہے۔ وہ کچھ دیر کے لئے یہی طے نہیں کر پاتا کہ وہ کہاں سے پلٹے۔ اس کے مقابلے میں پرجوش انقلابی حاصل ہے جو اپنے نظریوں اور عقیدے کے بارے میں روانی سے بول سکتا ہے اور جس کا اصول اپنے مقصد کے ساتھ وفا ہے۔ ان بظاہر دو متضاد کرداروں کو موسیقی متحد کرتی ہے۔ وائلن اس زمانے سے انڈونیشیا میں مقبول ہے جب سولہویں صدی میں پرتگالی ثقافتی اور سیاسی اثرات نے

مجمع الجزائر کو متاثر کرنا شروع کیا تھا۔عیسیٰ اور حاضل دونوں ایک ہی ساز کو پسند کرتے ہیں اور حاضل تو ماہر موسیقی بھی ہے۔

دونوں کے درمیان عیسیٰ کی بیوی فاطمہ کا کردار ہے۔شادی کے چھ ماہ بعد سے ہی عیسیٰ نامردی کا شکار رہتا ہے اور جیسے جیسے دونوں کی دوستی بڑھتی ہے حاضل فاطمہ کے قریب آ جاتا ہے۔فاطمہ کے ساتھ اس کی ناشائستہ حرکت کے ذریعے اپنے دوست سے غداری، ایک طرح سے عیسیٰ کے ساتھ اس آخری غداری کا آغاز ہے جو ولندیزیوں کی طرف سے اذیت رسانی برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے عیسیٰ کو برداشت کرنا پڑی۔

عیسیٰ خوفزدہ آدمی ہے، تشدد کا خوف، بیوی کا خوف، اپنے ننھے منہ بولے بیٹے کی ناخوشی کا خوف، وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے، کوئی لفظ بولنے سے ڈرتا ہے۔یہ خوف اس نفسیاتی کیفیت سے متعلق ہے جو اسے نامرد بنا دیتا ہے اور جس کا، اس کے ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق، صرف کسی باہر کی چیز سے یا کسی جذبے سے نہیں، بلکہ فیصلے کرنے کے خوف میں مبتلا ہے۔اس کے لئے واقعات ہی اس کے فیصلے کرتے ہیں اس نے انقلاب کو نہیں چنا بلکہ انقلاب نے اسے چنا ہے اور یہ ''عدم فیصلہ'' اسے اس سڑک کے آغاز پر لے آیا ہے جس کا کوئی آخری سرا ہی نہیں۔ایسے شجاعانہ کام کرنے کے لئے نہیں جن کے گیت ملک کی تاریخ میں گائے جائیں بلکہ صرف اپنے آپ سے سمجھوتہ کرنے اور اپنی شدید کمزوری اور خوف کے ہمراہ زندہ رہنے کے لئے اسے منتخب کیا گیا ہے۔

اس سے بھی کچھ زیادہ یہ کہ چونکہ خوف اس کی نامردگی کی بنیاد ہے اس لئے اپنی مردانگی کی بازیابی کے لئے انقلاب کی یہ سڑک اس کے نفسیاتی سفر کی ترجمان بھی ہے۔اس ضمن میں عیسیٰ صرف ایک فرد عیسیٰ نہیں ہے بلکہ انڈونیشیا کی علامت ہے جو اپنی توانائیوں کو سمیٹنے کے قابل نہیں ہے اور جو اپنی طرح کے ہزاروں کمزور لوگوں کے اندر معاشرتی اور اخلاقی قوت پیدا نہیں کر سکتا۔ایسے کمزور لوگ جو ایسا معاشرہ وجود میں لائیں جو اس ملک کی اخلاقی قدآوری پیدا کرنے سے منسوب ہو اور جس کے دم سے انسانی مسرت تک رسائی ممکن ہو۔

ناول کے پہلے صفحے سے سڑک کا یہ تصور پورے ناول میں بار بار نمایاں ہوتا

ہے، جب کالی گلیوں میں ٹرک کے پہیے گرجتے ہوئے اس چلتی پھرتی سڑک پر سے گزرتے ہیں جس کا کوئی آخری سرا نہیں ہے۔عیسیٰ کے خیالات اس سڑک سے قوت حاصل کرتے ہیں اور یہ سڑک راتوں کی تاریکی میں اس کے خوابوں کے تعاقب میں رہتی ہے جب کہ اس سڑک پر پلٹ جانے کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔جس طرح جکارتہ میں بارش کے ساتھ بادلوں کی گرج شامل ہو جاتی ہے اس طرح کبھی کبھی وہ ایک جھپک میں ایک ایسا کوندا لپکتا دیکھتا ہے جو گھپ اندھیرے کو چیر ڈالتا ہے۔ پھر اسے قرآن کے اس مشہور حصے کی گونج بھی سنائی دیتی ہے جس میں زندگی کو ایک طوفانی رات میں سفر کرنے کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔''بجلی کی روشنی ان کی آنکھیں چندھیا دیتی ہے اور جب انہیں روشنی ملتی ہے تو وہ چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو رک جاتے ہیں۔(قرآن ۲:۲)

عیسیٰ کو اس سڑک کا کماحقہ،شعور حاصل نہیں جس پر اس نے قدم رکھا ہے مگر حاضل کو یہ سڑک صاف نظر آتی ہے اور اس کا بھرپور احساس تخصیص اس کے ایک ایسے نغمے میں اظہار پاتا ہے جس میں وہ کہتا ہے .... یہ موسیقی انسان کی بحثیت انسان جدوجہد کا گیت گاتی ہے۔ میرے نزدیک فرد حقیقت ہے، حقیقت تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ نہیں ہے۔ یہ نغمہ میری زندگی ہے۔ یہ وہ انقلاب ہے جس کا ہم نے آغاز کیا ہے۔مگر انقلاب حصول آزادی کا محض ایک ذریعہ ہے اور آزادی انسان زندگی کی مسرت اور شرافت کو شاداب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔''

مگر عیسیٰ کی سردمہری جاری رہتی ہے وہ اپنی انفرادیت میں سرشار رہنے کے بجائے ایک گروہ میں گمنام طور پر شامل رہنے کو ترجیح دیتا ہے جہاں اسے صدموں اور خراشوں سے نجات حاصل ہوتی ہے۔اس کے باوجود یہ وہی ہے جس نے حاضل کی موسیقی کو آرکسٹرا میں سمونے کی زبردست تجویز پیش کی ہے۔ وہ حاضل کے اس کردار سے آشنا ہے جو انڈونیشیا کی تاریخ میں اس وقت سے گونج رہا ہے جب حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ سو سال پہلے شرق الہند میں ڈونگ سونگ کی کانسی کی ثقافت آئی۔تب اس کی بازگشت، سنیاسیوں کی روح کو نشے کی سی کیفیت میں آسمانوں پر لے جانے کا ذریعہ رہی اور عیسیٰ کی تجویز یہ تھی کہ ہمیں طبل کو اس طرح کی یک آہنگ صورت پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہئے جس سے ہماری مطلوبہ فضا پیدا ہوگی اور تب ہم طبل کی آواز کو آہستہ آہستہ دور لے

جائیں گے تاکہ وہ نغمے کے پس منظر کی موسیقی کا کام دیتی رہے۔ اس کی یہ تجویز حیرت انگیز حد تک بیتھوون کے مزامیری نغمے کی یاد دلاتی ہے۔

حاضل کی موسیقی کی تشریح کے لئے اس سے زیادہ بھی کہا جا سکتا ہے اور اس کے نغماتی کیفیت کو انسان کی طرف سے مسرت کی تلاش کی تجیم قرار دیا جا سکتا ہے اور طبل کو انڈونیشی فرد کی اس جستجو کا وہ حصہ جس میں تنہائی ہے، خوف ہے، مسرت ہے اور دہشت ہے۔ اس سے منشور کا یہ اعتراف یاد آتا ہے کہ ''یہ انڈونیشی ثقافت کرہ ارض کے ہر گوشے سے آنے والے محرک کے سلسلے میں ہمارے ردعمل سے صورت پذیر ہوگی۔''

.... ایک محدود احساس قومیت کے بجائے کھلی قوم پرستی، جسے اپنے وقار پر اعتماد ہو، لوبس کا بنیادی یقین ہے۔ ایک لمحے کے لئے جب ہم بیتھوون کے مزامیری نغمے کی ابتدا میں طبل اور وائلن کے مکالمے کے بارے میں سوچتے ہیں تو کتاب کے بین السطور معانی کے ترفع کا احساس ہوتا ہے اور تب ہم عیسیٰ اور حاضل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جب وہ اپنے نئے نغمے کے لئے باری باری وائلن اور طبل بجاتے ہیں۔ یہ کتاب جلدی میں لکھی گئی اس لئے اس میں خامیاں بھی ہیں، ناول میں ایک اساسی ہم آہنگی بھی ہے جو موسیقی کی اصطلاحات میں سمجھی جا سکتی ہے۔ خوف کے بنیادی تصور، خود آگہی، نامردی، بجلی کے کوندے، سڑک .... یہ تمام آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور طبل کا نفوذ کرتا آہنگ بجلی کی کڑک، خالی گلیوں میں ٹرک کے پہیوں کی دھمک اور عیسیٰ کے دل کی دھک دھک ایک الوہی نغمے کی طرح اسے خوف سے آخری خلاصی کی طرف لئے جاتی ہے۔

کتاب کے اہم موضوعات سربرآوردہ دانشور شجاعت موکو کی تحریروں سے منطقی منصوبہ بندی حاصل کرتے ہیں۔ شجاعت نے قومی ثقافت پر اپنے معروف مضمون میں لکھا تھا۔ ''انسان کا کسی نسل یا حکومت کی خدمت گزاری کے لئے ایک ہتھیار بن کر رہ جانا انڈونیشی شخصیت کے سراسر منافی ہے۔ انقلاب کے خاتمے پر فن اور فنکار کا مقدس ترین کام انڈونیشی انسان کی انسانیت کا تحفظ ہے کہ وہ سکیموں اور منصوبوں کی دلدل میں ڈوب نہ جائے اور محض ایک آلہ بن کر نہ رہ جائے، چاہے اس آلے کے مقاصد (اور نیت) اچھے ہوں۔ حاضل انہی خیالات کا اظہار کر رہا ہے جب وہ کہتا ہے۔ ''میرے لئے تو فرد مقصد

MashalBooks.org

ہے نہ کہ مقصد کا ذریعہ'' مملکت ایک ذریعہ ہے اور فرد کو مملکت کا ماتحت نہیں ہونا چاہیے۔''

اس طرح کے جذبات ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۵ء تک سکارنو کے ساتھ عقیدت اور انڈونیشیا کی زندگی کے ہر پہلو کو انڈونیشی شخصیت اور مملکت کے ماتحت رکھنے کی کوشش کی روشنی میں ایک بدشکل مسکراہٹ ہی پیدا کر سکتے تھے۔ مگر نکتہ یہ ہے کہ ۱۹۵۰ء سے لوبس نے اس طرح کی صورت حال پیدا ہونے کا اندازہ لگایا تھا اور ۱۹۵۹ء میں شجاعت موکو نے سکارنو کے قومی شخصیت کے نظریے کو اس کے اپنے خالق کے خلاف استعمال کرنے کی جرأت اور ہنرمندی کا مظاہرہ کر دیا۔ جب لوبس کو قید کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عالمگیر انسان دوستی کے نظریے کا موید تھا۔ جب کہ اس وقت اس نظریے کو قدامت پسندانہ، معاشرتی لحاظ سے غیر تخلیقی اور بورژوا قرار دیا جاتا تھا اور لوبس مصر رہتا تھا کہ وہ پہلے انسان ہے، ایک آزاد فرد ہے اور پھر انڈونیشی ہے۔

مغرب کی ادبی روایت کے پیش نظر مجھے اس کتاب میں سٹین بک کے'' دی مون از ڈاؤن'' کی گونج سنائی دیتی ہے۔ موضوع اور ترکیب قریب قریب ایک ہیں............... ایک آبادی کے سیدھے سادے لوگ جب دشمن کے قبضے کی وجہ سے مسلسل ہراس میں رہتے ہیں، آہستہ آہستہ اپنی آزادی خطرے کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ میئر آرڈن جس پر تمام ذمہ داری عائد ہوتی ہے، آہستہ آہستہ اور مذبذب، اس موقف کی طرف راستہ ٹٹولتا ہوا بڑھتا ہے جسے بہرصورت اختیار کرنا ہوگا۔ عیسیٰ کی طرح وہ بھی ایک ایسا شخص ہے جو خوف سے متعارف ہے اور اپنے انداز میں اس پر قابو پانا سیکھ جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست ونٹر سے کہتا ہے'' تم جانتے ہو ڈاکٹر کہ میں چھوٹا سا آدمی ہوں اور یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر ہم چھوٹے لوگوں میں وہ چنگاری ضرور ہونی چاہیے جو بعد میں بھڑک کر شعلہ بنے۔ میں جانتا ہوں کہ میں بری طرح خوفزدہ ہوں اور میں نے اپنی زندگی بچانے کے لئے بہت کچھ سوچا ہے مگر اب وہ کیفیت چلی گئی ہے اور اب میں کبھی کبھی فرط انبساط سے محسوس کرتا ہوں جیسے اب میں بڑا ہوں اور جیسا ہوں اس سے کہیں بہتر ہوں...........''

دونوں کتابوں کا تعلق انسانی وقار سے ہے.......... ایک واضح فرد سے نہ کہ ہجوم میں ایک گمنام آدمی سے۔ جب آرڈن کہتا ہے۔'' آزاد لوگ جنگ شروع نہیں کرتے

مگر جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو وہ شکست کی حالت میں بھی لڑتے رہتے ہیں۔ ہجوم میں شامل لوگ جو ایک رہنما کے پیرو ہوتے ہیں ایسا نہیں کر سکتے، چنانچہ یہ ہجوم ہمیشہ لڑائیاں جیتتا ہے مگر آزاد لوگ جنگیں جیتتے ہیں۔'' وہ حاصل کا بیان دہرا رہا ہے۔ ''انسانی جدوجہد ایک ہجوم کی جدوجہد نہیں ہے۔ یہ ان گیدڑوں کی بھونک نہیں ہے جو اکٹھے ہو کر شکار پر نکلتے ہیں بلکہ زندگی کی جدوجہد میں ایک منفرد گیدڑ کی بھونک اور غراہٹ اور درد اور چیخ ہے۔'' تاہم موضوع میں ایک بنیادی فرق ہے۔ لوبس کی کتاب انسان سے بحیثیت انسان زیادہ کھرے پن سے وابستہ ہے۔ سیٹن بک نے ہٹلر کے خلاف جنگ میں سقراط سے آج تک کی مغربی تہذیب کا سہارا لیا ہے اور ناروے کے دیہاتیوں کو ہلٹری ظلمت میں مشعل بردار کا کردار سونپا ہے۔ لوبس نے انڈونیشی انقلاب کی تائید میں نہیں لکھا۔ یہ انقلاب اس کی نظر میں اس سے کہیں بڑی جدوجہد کا ایک حصہ ہے .... یہ انسانی روح کے وقار کو بیدار کرنے کا مقدس سفر ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ہاتھ بے عیب صفات منصوب کرنے پر اپنے آپ کو مجبور نہیں پاتا۔ کسی بھی انسانی تحریک کی طرح انقلاب میں خیر کے ساتھ شر بھی شامل ہوتا ہے اور وحشی اونٹونگ سے کردار کی اور بے مقصد قتل و غارت بھی، جس کے بارے میں لوبس نے لکھا ہے۔ یہ سب حاصل کی عظیم مثالیت کا حصہ ہے۔

ترقی پذیر قوموں کے جدید ادب میں اس طرح کے تجربات موجود ہیں اور ادیبوں کے ذہنوں پر یہی چیلنج، ترغیبات اور دباؤ حاوی ہیں۔ جب اپنی پسند سے وطن بدر ہونے والا جنوبی افریقہ کا ادیب ایزیکیل فاہلیلی لکھتا ہے کہ دشمنوں نے اس سے نو آبادیت، جدید نو آبادیت اور شاہیت سے وابستہ کر دیا ہے تو جدید انڈونیشی ادب کا طالب علم محسوس کرتا ہے کہ وہ یہاں بھی رہ چکا ہے اور جب وہ کہتا ہے ''ہم جنوبی افریقہ والے گزشتہ تین سو سال کے تشدد کے دوران سفید فاموں کی برتری کے خلاف خونی جدوجہد میں مصروف ہیں .... افریقی وقار کے لئے نہیں بلکہ اپنے انسانی وقار کے لئے۔ رہا ہمارا افریقی وقار، تو وہ تو ہے ہی مسلمہ حقیقت۔'' تو وہ افریشیائی ملکوں کے نفسیاتی اور ادبی ارتقا کے ضمن میں ایک نازک مسئلے کو چھوتا ہے۔ جب وہ اس حیرت پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ ''آخر ادبی فضا میں اتنا بگاڑ کیوں ہو کہ روایت پر پورا اترنے والے معیاروں سے مختلف معیاروں کے ذریعے جدید ادب کو پرکھا جائے گا؟ آخر وہ اس

معاشرتی حوالے سے پرکھے جانے سے کیوں ڈرے جس سے اس نے جنم لیا اور وہ ایک ''سیاہ بہروپ'' کے پیچھے چھپنے کے لئے کیوں بھاگا پھرے؟'' .... ''سیاہ بہروپ'' (سیاہ فامی کے تفاخر) کی جگہ سوکارنو کے انڈونیشی شخصیت کی اساطیر سازی کا نظریہ رکھ لیجیے یا ماؤزے تنگ کا ''مزدور اور کسان'' اور دیگر طبقاتی وفاداریاں جو جماعت کی سچائی کو انسانی اور اخلاقی سچائیاں سے برتر قرار دیتی ہیں۔

''بے منزل سفر'' اس وقت کی صورت حال کے دباؤ کے باوجود، جب اسے تحریر کیا گیا، انسان کا بحیثیت انسان ذکر کرتا ہے۔ اس طرح اس کی اہمیت اس کی بنیادی، ادبی، قدر و قیمت سے بھی زیادہ ہے کیونکہ قاہلیلی کی طرح لوبس کا بھی پیغام یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی سب سے بڑی ضرورت، رنگ، نسل اور مذہب میں حقیقی اور خیالی کوتاہیوں کو چھپانے سے اجتناب کرنا ہے۔ اس طرح کتاب کے آغاز میں جولس رومینز کا جو یہ اقتباس درج ہے اس کی معقولیت واضح ہو جاتی ہے۔ ''خوف سے آزاد ہونے کے لئے ہمارے پاس کیا ہونا چاہیے؟'' .... کس قسم کا خوف؟ .... اس بزدلانہ عدم تحفظ کے احساس سے تو قطعی نہیں جو اس طرح کے بدشکل خیالات میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے جیسے سیاہ فامی کا تفاخر، قومی شخصیت اور اس طرح کے دیگر خیالات۔

لوبس اور شجاعت موکو کے خیالات کے درمیان جو باہمی ربط ہے اسکی وضاحت ممکن ہے کیونکہ لوبس بھی ایک دانشور ہے۔ میرے نام ایک خط میں اس نے واضح کیا تھا کہ اپنی توانائیوں کو ادب کے بجائے صحافت کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ اس نے سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس طرح وہ جمہوریت اور انفرادی ذمہ داری کے بارے میں اپنے نظریات کو زیادہ لوگوں تک پہنچا سکے گا۔ اگر اس کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جرأت مند آدمی ہے، تو وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ وہ خوف سے باخبر ہے اور اپنے اداریوں کے نتائج سے خوفزدہ تھا اور اس لمحے کے انتظار میں تھا جب اس کے دشمن اس کے قلم کو خاموش کر دیں گے۔ اعصابی تناؤ .... انڈونیشیا میں متضاد قوتوں کا نازک توازن .... انتہائی پیچیدہ ہے۔ لوبس کے نزدیک تاریخی حالات کے حوالوں اور خاص التجاؤں سے اس کے ان اصولوں پر کوئی زد نہیں پڑتی کہ قوم کو خواہ کسی بھی صورت حال کا سامنا ہو، جب تک اسے فرد کی آزادی کا اعتماد نہ ہو، وہ خوداعتادی

سے محروم رہتا ہے کیونکہ لوگ جنہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا، وہ دوسروں کی طرف سے تحفظ کے دھوکے میں مبتلا ہونا پسند کرتے ہیں۔ اس کے پیغام کا نچوڑ یہ ہے کہ ہر شخص کو اتنی جرأت حاصل کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے ایک راستے پر مردانہ وار چل سکے چاہے اسے تنہا جانا پڑے۔

اخبار نویس کی حیثیت سے بھی لوبس نے اپنے تصور پر اپنا ایمان پختہ رکھا جو اس نے اس ناول میں پیش کیا ہے۔ تاہم کیا امید کرنا زیادتی ہے کہ پختہ عمر تک پہنچنے پر وہ ادب کی طرف پلٹ آئے گا اور اپنے قارئین کو ''بے منزل سفر'' سے کچھ آگے لے جائے گا؟

اینتھنی ایچ، جونز
پروفیسر انڈونیشی زبان اور ادب
آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی
کینبرا

MashalBooks.org

(1)

بونداباندی اور ابر آلود موسم نے وقت سے پہلے اندھیرا کر دیا تھا۔ گرج چمک سے سارا افق روشن تھا لیکن اس لمحاتی روشنی کے بعد تاریکی اور بھی گہری ہو جاتی تھی، بارش سے پناہ کیلئے ادھر ادھر بھاگتے چند لوگوں کے سوا سڑکیں خالی اور ویران تھیں، شہر میں خوف کی فضا مسلط تھی۔

خالی گلیاں، درشت چہروں والے سپاہیوں سے بھرے ٹرک کے پہیوں کے شور سے گونج رہی تھیں۔ ٹرک دائیں طرف مڑا، سیدھا سامنے گیا، پھر بائیں طرف مڑا، پھر دائیں اور پھر آگے ہی آگے، ویران اور خالی گلیوں میں.......... اردگرد اندھیرے اور بارش میں لپٹی رات پھیلی تھی............اور بغیر کسی منزل کے ایک سڑک.................

جکارتہ۔ ستمبر ۱۹۴۶ء۔ صبح

گنگ جکسا میں تین بچے کھیل رہے تھے، ایک نے پتنگ کی ڈور کس کر پکڑ رکھی تھی، دوسرا پنجوں کے بل سے اونچا کیے کھڑا تھا اور تیسرا ہدایات دے رہا تھا ''غلط، غلط ہوا دوسرے رخ پر ہے، جگہ بدلو'' دونوں نے اس کی ہدایت مان لی۔ ''بس اب ٹھیک ہے، اب اسے جانے دو۔ جلدی جلدی۔''

گنگ کیبون سری وتین سے ایک اور بچہ آیا جو کھیلنے والے تینوں بچوں سے بڑا اور مضبوط تھا۔ اپنی چال ڈھال اور شکل وشباہت سے وہ کوئی مقامی دھونسو، لگتا تھا، اس کے ہاتھ میں کٹھل کے پیڑ کی چھڑی تھی۔ گلی کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر اس نے دائیں بائیں دیکھا، کھیل میں مصروف بچوں کو دیکھ کر مسکرایا اور ان کی طرف چل دیا۔

''میں جوجو کی پتنگ چھین لوں گا'' اس نے نہایت اطمینان سے سوچا۔ یہ خیال

MashalBooks.org